قصۂ موسیٰؑ و خضر علیہما السلام سے مستنبط اُصولِ تحقیق کا معاصر نظامِ تحقیق و تدریس پر اطلاقی مطالعہ

The Principles of Research derived from the Qur'anic Story of al-Khadhir and Moses (A.S): An Applied Study on the contemporary system of Education & Research

ڈاکٹر سعید الرحمٰن *

سعید الحق جدون **

Abstract

The Holy Quran is such a comprehensive and perfect divine book that mankind can seek guidance from it irrespective of whatever walk of life including education and research. The Holy Quran emphasizes education and research so much that its very first revelation is about Reading (Education). The rules and principles which the Holy Quran has laid for learning and research are the very essence of our whole education system. Today, we have many new systems, emerging methods of research and latest ways of learning but if we try to probe into the matter we come to know that the Holy Quran has given many of these methods, principles and ways of learning and research fourteen Hundred years ago. That's why the noble Quran has a great and central place in all the theories and principles of education and research. The paper in hands presents a scholarly applied study of the Principles of research derived from the Qur'anic Story of al Khidr and Moses (A.S) on our contemporary system of Education & Research. The Muslim researchers should specifically focus on this aspect of the under reference Qur'anic Story.

Keywords: Islamic Principles of Research, Education in Islamic Perspective, The Qur'anic Story of al-Khidr & Moses, Research Rules.

جدید دور انسانی زندگی کے جملہ شعبوں میں تحقیق و جستجو کے عروج کا دور ہے جس کی اہمیت و معنویت سے کسی کو انکار نہیں۔ تحقیق ایک محتاط، سرگرم جستجو اور مسلسل کاوِش اظہار ہے، جس میں مروّجہ حقیقتوں کی تصدیق، نئی حقیقتوں کی تلاش اور سچائی کی کھوج مضمر ہے جس کے منطقی نتائج تمام علوم کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے علم و فن کی نئی راہیں دریافت ہوتی ہیں، نئی حقیقتیں ابھرتی ہیں اور نئے انکشافات جنم لیتے ہیں۔ ان نئی دریافتوں، نئے حقائق اور نئے انکشافات کی روشنی میں مروّجہ نتائج یا نظریات پر نظرِ ثانی کی جاتی ہے اور ان کے اثرات کا کھوج لگا کر اس کی صحیح تاویل پیش کی جاتی ہے [1]۔

تحقیق کا مقصد حیاتِ انسانی میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر حل طلب مسائل کو آسان انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرنا ہوتا ہے جس کے لیے محققین اپنے علم و ہنر کو استعمال میں لاتے ہوئے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ تحقیق ایک فن ہے جس کے لیے ماہرین و محققین نے مختلف اسالیب اور مناہج وضع کیے ہیں اور مفصل اصول و قواعد بیان کیے ہیں، کسی نے تحقیق کے سائنسی بنیاد پر اصول واضح کیے، تو کسی نے ادبی بنیاد پر، اس طرح کسی نے تحقیق کے فنی اصولوں کو قلم بند کیا تو کسی نے اس فن کے اسلامی اصولوں کی تدوین کو ترجیح دی، تاہم اس حوالے سے قرآن کریم نے بھی بعض مقامات پر رہنمائی فرمائی ہے، جس کا جاننا اور اس پر مزید تحقیق کرنا محققین بالخصوص مسلم تحقیق کاروں کی ایک اہم ذمہ داری بنتی ہے۔

---

* انٹرنیشنل پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلو، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد / اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علومِ اسلامیہ، عبد الولی خان یونیورسٹی مردان، saeed@awkum.edu.pk

** پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علومِ اسلامیہ، عبد الولی خان یونیورسٹی مردان saeedulhaqjadoon@gmail.com

اسلام دینِ فطرت ہے جو حیاتِ انسانی کے جملہ اُمور و معاملات میں نہ صرف رہنمائی کرتا ہے بلکہ زندگی گزارنے کا صحیح ڈھنگ اور سلیقہ بھی سکھاتا ہے۔ قرآن کریم وہ جامع کتاب ہے جس میں ڈھونڈنے والوں کو ہر فن کے حوالے سے کچھ نہ کچھ رہنمائی مل سکتی ہے۔ تحقیق اور اُصول تحقیق کے حوالے سے جہاں قرآن کریم کی دیگر آیاتِ کریمات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، وہاں سورۃ الکھف میں سیدنا موسیٰ اور سیدنا خضر علیہما السلام کے قصہ سے بھی کافی رہنمائی مل سکتی ہے، مفسرین نے اس واقعہ سے جہاں دیگر تعلیمی اصول مستنبط کئے ہیں، وہاں متخصصین کے لیے بھی کئی اہم اصول کی نشان دہی کی ہے، جس کی موجودہ تحقیقی نظام پر تطبیق اور اطلاق کرنے سے کئی اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں سورۂ کہف میں مذکور واقعۂ سیدنا موسیٰ وخضر علیہما السلام سے مستنبط ان "اصولِ تحقیق " کو زیر بحث لایا گیا ہے، جو کسی نہ کسی طریقے سے ہمارے معاصر نظامِ تحقیق وتدریس اور ہمارے جامعات پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ تحقیق کے حوالے سے قرآنِ کریم نے جو قواعد پیش کئے ہیں، وہ تعلیمی و تحقیقی میدان میں بنیادی ماخذ اور اصل الاصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں پر وہی مستنبط اصول و آدابِ تحقیق پیشِ خدمت ہیں۔

قرآنی واقعۂ سیدنا موسیٰ وخضر علیہما السلام کا پس منظر:

مذکورہ واقعہ سے اصولِ تحقیق مستنبط کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ اس کا اجمالی پس منظر بیان کیا جائے تا کہ آئندہ مباحث سمجھنے میں سہولت ہو۔ اس واقعہ کا قرآن کریم کے علاوہ احادیثِ نبویہ میں بھی تذکرہ موجود ہے۔ اس کو امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں نقل کیا ہے جہاں پر اس کا بالتفصیل مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ امام بخاریؒ نے سعید بن جبیرؒ[2] سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابن عباسؓ[3] سے کہا:

"إِنَّ نَوْفًا البَكَالِيَّ يَزْعُمُ: أَنَّ مُوسَى صَاحِبَ الخَضِرِ لَيْسَ هُوَ مُوسَى بَنِي إِسْرَائِيلَ، إِنَّمَا هُوَ مُوسَى آخَرُ، فَقَالَ: كَذَبَ عَدُوُّ اللَّهِ، حَدَّثَنَا أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " أَنَّ مُوسَى قَامَ خَطِيبًا فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ، فَسُئِلَ أَيُّ النَّاسِ أَعْلَمُ؟ فَقَالَ: أَنَا، فَعَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِ، إِذْ لَمْ يَرُدَّ العِلْمَ إِلَيْهِ، فَقَالَ لَهُ: بَلَى، لِي عَبْدٌ بِمَجْمَعِ البَحْرَيْنِ هُوَ أَعْلَمُ مِنْكَ قَالَ: أَيْ رَبِّ وَمَنْ لِي بِهِ؟ وَرُبَّمَا قَالَ سُفْيَانُ، أَيْ رَبِّ، وَكَيْفَ لِي بِهِ؟ قَالَ: تَأْخُذُ حُوتًا، فَتَجْعَلُهُ فِي مِكْتَلٍ، حَيْثُمَا فَقَدْتَ الحُوتَ فَهُوَ ثَمَّ، وَرُبَّمَا قَالَ: فَهُوَ ثَمَّهْ، وَأَخَذَ حُوتًا فَجَعَلَهُ فِي مِكْتَلٍ، ثُمَّ انْطَلَقَ هُوَ وَفَتَاهُ يُوشَعُ بْنُ نُونٍ، حَتَّى إِذَا أَتَيَا الصَّخْرَةَ وَضَعَا رُءُوسَهُمَا، فَرَقَدَ مُوسَى وَاضْطَرَبَ الحُوتُ فَخَرَجَ، فَسَقَطَ فِي البَحْرِ فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي البَحْرِ سَرَبًا۔"[4]

"کہ نوف بکالی[5] کا خیال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جو خضر کے پاس گئے تھے، وہ بنی اسرائیل کے موسیٰ نہیں تھے، بلکہ دوسرے تھے، یہ سن کر ابن عباسؓ نے فرمایا: اللہ کے دشمن نے جھوٹ بولا ہے۔ پھر فرمایا: ہم نے ابی بن کعبؓ[6] سے اور انھوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ ایک دن موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کھڑے ہو کر خطبہ دیا، تو پوچھا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ عالم کون ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں ہوں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب کیا کہ تم نے علم کی نسبت کیوں اس کی طرف نہیں کی، تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دو دریاؤں کے سنگم پر میرا ایک بندہ ہے وہ وہ تجھ سے زیادہ علم رکھنے والا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے پروردگار! میری ان سے ملاقات کیسے ہو؟ تو حکم ہوا: "ایک مچھلی زنبیل میں رکھ لو، پھر جہاں تم اس مچھلی کو کھو دو گے تو وہ

بندہ تمہیں وہیں ملے گا۔ تب موسیٰ علیہ السلام چلے اور ساتھ اپنے خادم یوشع بن نون[7] کو لے لیا اور انہوں نے زنبیل میں مچھلی رکھ لی، جب ایک پتھر کے پاس پہنچے، تو دونوں اپنے سر اس پر رکھ کر سو گئے اور مچھلی زنبیل سے نکل کر دریا میں اپنی راہ بناتی چلی گئی۔"

درج بالا تمہید کے بعد اس واقعہ کی مزید تفصیل اس روایت کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے حوالے سے بھی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ پھر دونوں سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور یوشع بن نون بقیہ دن اور رات چلتے رہے، جب صبح ہوئی تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے خادم سے کہا:

"آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا" [8]

"ہمارا ناشتہ لاؤ، یقیناً اس سفر سے ہم کو بڑی تکلیف پہنچی ہے۔"

خادم نے کہا: کیا آپ نے دیکھا تھا کہ جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے، تو میں مچھلی کا ذکر بھول گیا تھا، یہ سن کر سیدنا موسیٰ ؑ بولے:

"ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلَى آثَارِهِمَا قَصَصًا" [9]

""یہی ہے وہ بات (جگہ) جس کی ہمیں تلاش تھی، تو پھر (دونوں) واپس ہو گئے۔"

سیدنا ابی بن کعبؓ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا سیدنا خضر علیہ السلام کے ساتھ ملاقات کی روداد اس روایت میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حَتَّى انْتَهَيَا إِلَى الصَّخْرَةِ، فَإِذَا رَجُلٌ مُسَجًّى بِثَوْبٍ، فَسَلَّمَ مُوسَى فَرَدَّ عَلَيْهِ، فَقَالَ وَأَنَّى بِأَرْضِكَ السَّلاَمُ؟ قَالَ: أَنَا مُوسَى، قَالَ: مُوسَى بَنِي إِسْرَائِيلَ قَالَ: نَعَمْ، أَتَيْتُكَ لِتُعَلِّمَنِي مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا، قَالَ: يَا مُوسَى: إِنِّي عَلَى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللَّهِ عَلَّمَنِيهِ اللَّهُ لاَ تَعْلَمُهُ، وَأَنْتَ عَلَى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللَّهِ عَلَّمَكَهُ اللَّهُ لاَ أَعْلَمُهُ، قَالَ: هَلْ أَتَّبِعُكَ؟ قَالَ: {إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا} وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَى مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا" [10]

"جب پتھر تک پہنچے تو دیکھا کہ ایک شخص کپڑا اوڑھے ہوئے موجود ہے، موسیٰ علیہ السلام نے انھیں سلام کیا، خضر علیہ السلام نے جواب دیا اور پوچھا: تمہاری سر زمین میں سلام کہاں؟ پھر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں موسیٰ ہوں، خضر علیہ السلام بولے: بنی اسرائیل کے موسیٰ؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں! پھر کہا: کیا میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں، تاکہ آپ مجھے ہدایت کی وہ باتیں بتلائیں جو اللہ نے خاص آپ ہی کو سکھلائی ہیں۔ خضر علیہ السلام بولے کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔ اے موسیٰ! مجھے اللہ نے ایسا علم دیا ہے جسے تم نہیں جانتے اور تم کو جو علم دیا ہے اسے میں نہیں جانتا۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی بات میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔"

اس کے بعد سیدنا خضر اور موسیٰ علیہما السلام دونوں دریا کے کنارے پیدل چلے، ان کے پاس کوئی کشتی نہ تھی کہ (اتنے میں) ایک کشتی ان کے سامنے سے گزری، تو کشتی والوں سے انہوں نے کہا کہ ہمیں بٹھا لو۔ سیدنا خضر علیہ السلام کو انہوں نے پہچان لیا اور بغیر کرایہ کے سوار کر لیا، اتنے میں ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ گئی، پھر سمندر میں

اس نے ایک یا دو چونچیں ماریں، اسے دیکھ کر سیدنا خضر علیہ السلام بولے کہ اے موسیٰؑ! میرے اور تمہارے علم نے اللہ کے علم میں سے اتنا ہی کم کیا ہو گا، جتنا اس چڑیا نے سمندر کے پانی سے۔ پھر سیدنا خضر علیہ السلام نے کشتی کے تختوں میں سے ایک تختہ نکال ڈالا، سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ان لوگوں نے تو ہمیں کرایہ لیے بغیر سوار کیا اور آپ نے ان کی کشتی کی لکڑی اکھاڑ ڈالی[11]:

"أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا"[12]

"آپ نے ان کی کشتی کی لکڑی اکھاڑ ڈالی (سوارخ کیا ہے کشتی میں) تاکہ یہ ڈوب جائیں۔"

سیدنا خضر علیہ السلام بولے کہ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکیں گے؟ اس پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ میری بھول چُوک پر گرفت نہ کیجئے، میں نے بھول کر یہ پہلا اعتراض کیا تھا۔ پھر دونوں کشتی سے اتر کر چلے حتیٰ کہ ایک لڑکے سے ملے جو دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، سیدنا خضر علیہ السلام نے اوپر سے اس کا سر پکڑ کر ہاتھ سے اسے الگ کر دیا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام بول پڑے:

"أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا"[13]

"آپ نے ایک معصوم جان کو بغیر کسی جان کے عوض مار ڈالا؟"

سیدنا خضر علیہ السلام بولے کہ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔ پھر دونوں روانہ ہوئے یہاں تک کہ ایک بستی والوں کے پاس آئے اور ان سے کھانا طلب کیا مگر انہوں نے کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے وہیں پر ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی۔ سیدنا خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے اسے سیدھا کر دیا۔ سیدنا موسیٰؑ بول اٹھے:

"لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا"[14]

"اگر آپ چاہتے تو گاؤں والوں سے اس کام کی اُجرت لے سکتے تھے۔"

سیدنا خضر علیہ اسلام نے کہا: "بس اب ہم اور تم میں جدائی کا وقت آ گیا ہے۔"

حدیثِ مبارکہ میں تو صرف ان سوالات کا ذکر آیا ہے جب کہ قرآن کریم میں ان سوالات کے جوابات کا بھی تذکرہ موجود ہے، جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اشکالات کئے، تو (آخر میں) خضر علیہ السلام نے ان کے جو جوابات دیے، وہ قرآن کریم میں یوں مذکور ہیں:

"أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًاo وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًاo فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًاo وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذَلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا"[15]

"چنانچہ وہ جو کشتی تھی، وہ چند مسکینوں کی تھی، جو سمندر میں مزدوری کیا کرتے تھے، میں نے چاہا کہ اُسے عیب دار کر دوں، کیونکہ ان کے دریا کے اُس پار ایک بادشاہ تھا، جو ہر کشتی زبردستی چھین لیتا ہے۔ اور جو لڑکا تھا (جسے قتل کیا گیا)، تو اس کے ماں باپ مؤمن تھے، سو ہمیں ڈر ہوا کہ اُنہیں اپنی سرکشی اور کفر سے تنگ کرے گا۔ سو ہم نے چاہا، کہ بدلے میں ان کو ان کا رب (ایسی اولاد) دے جو اس سے اخلاق میں بہتر ہو اور صلہ رحمی میں زیادہ قریب ہو۔ اور رہ گئی وہ دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی، جو اس شہر میں رہتے تھے، اور اس کے نیچے ان کا مال (خزانہ) دبا تھا، اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ پس تیرے رب نے چاہا کہ وہ (یتیم بچے) جب پہنچیں اپنے زور کو یعنی جوان ہو جائیں تو اپنا دبا ہوا مال (خزانہ) نکال لیں، یہ آپ کے رب کی طرف سے مہربانی تھی اور میں نے یہ (جو کچھ کیا ہے) اپنے اختیار سے نہیں کیا، یہ ان باتوں کی حقیقت ہے جن پر آپ صبر نہ کر سکے"

رسول اللہ ﷺ اس واقعہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"يَرْحَمُ اللَّهُ مُوسَى لَوْ كَانَ صَبَرَ لَقُصَّ عَلَيْنَا مِنْ أَمْرِهِمَا"[16]

"اللہ موسیٰ (علیہ اسلام) پر رحم فرمائے، اگر وہ کچھ دیر اور صبر فرماتے تو ان دونوں کے مزید واقعات بیان کئے جاتے (مگر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی عجلت نے اس علم لدنی کے سلسلہ کو جلد ہی منقطع کرا دیا)۔"

مذکورہ واقعہ سے مستنبط اصولِ تحقیق:

یہ واقعہ تعلیمی و تحقیقی نظریات اور تصورات کی بنیاد ہے، اس واقعہ کے جزیات پر تدبر کرنے سے تعلیم و تحقیق کے حوالے سے کئی پہلو سامنے آسکتے ہیں، بلکہ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس واقعہ سے تعلیم و تحقیق کے اہم اور بنیادی اصول اخذ ہوتے ہیں۔ یہ اصول اور ضوابط مختلف مفسرین نے اس واقعہ سے مستنبط کئے ہیں جو ہر محقق کی ضرورت ہے۔ ان اصول و ضوابط سے عصر حاضر میں تحقیق و تدریس کے عمل پر مختلف قسم کے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ اس واقعہ کے تناظر میں ان تحقیقی و تدریسی اصولوں کو اور موجودہ تحقیقی اداروں اور محققین پر ان کے اثرات کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

1۔ تحقیق کے لیے مطالعاتی اسفار (Study Tours/Academic Trips) کا قرآنی تصور:

تحقیقی عمل میں بسا اوقات تحقیق کار کو حصولِ کوائف (Data Collection) کے لیے دور دراز کا سفر کرنا پڑتا ہے، یہ سفر کبھی مشاہدے کے لیے ہوتا ہے، کبھی کسی ماہر فی الفن سے استفادے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی کبھار کسی لائبریری میں متعلقہ مصادر و مراجع تک رسائی کے لیے، جس کو جدید اصطلاح میں مطالعاتی سفر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عصر جدید میں اس کی ایک شکل قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں کے اسفار بھی ہیں، جہاں محققین اپنے تجربات اور مشاہدات ایک دوسرے کے ساتھ شئیر کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کی تحقیق سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔

قصۂ موسیٰ و خضر علیہما السلام بھی مطالعاتی سفر کی ایک روداد ہے، جس میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنے خادم یوشع بن نون کے ساتھ مزید تعلیم و تحقیق کے لیے سیدنا خضر علیہ السلام کے پاس گئے تھے۔ اس سفر کے احوال سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ کسی بھی فن میں مزید تحقیق کے لیے سفر کرنا ضروری ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کی آیت "وَاِذْ قَالَ مُوْسٰي لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ"[17] سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ سکالرز کے لیے مطالعاتی دوروں کا اہتمام کرنا چاہئے۔ امام بخاریؒ نے "کتاب العلم" میں قصہ موسیٰ و خضر کا واقعہ

اس وجہ سے ذکر کیا ہے، کہ طلبہ اور سکالرز میں مطالعاتی دوروں کا شوق پیدا ہو جائے۔[18] ان مطالعاتی دوروں میں سربراہی کے لیے استاد کا ساتھ ہونا ضروری ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ (تدریسی، تعلیمی وانتظامی امور میں) استاد جو کچھ کہے اس کو بلا چوں وچراں تسلیم کرنا چاہیے (بشرط یہ کہ اس میں کوئی خلافِ شریعت امر نہ ہو) تاکہ طلبہ کے درمیان کوئی تنازعہ اور اختلاف وانتشار پیدا نہ ہو۔[19]

آج کل یونیورسٹیوں میں مطالعاتی دوروں کا رجحان کم ہوتا جارہا ہے اور اگر جانے کی نوبت آ بھی جائے تو اکثر و بیشتر سیر و تفریح یاسیاحتی مقامات کو ترجیح دی جاتی ہے، کسی علمی اور تحقیقی مقام کو کم ترجیح دی جاتی ہے، جو سکالرز کے لیے وقتی تفریح کا باعث بن سکتا ہے، لیکن جو مقاصد مطالعاتی دوروں سے حاصل کی جاسکتی ہیں، وہ ان سے محروم رہ جاتے ہیں۔اس لیے مطالعاتی دوروں کے حوالے سے اس قرآنی تصور کو سامنے رکھ کر اسی سلسلے کو جاری رکھنا تعلیم و تحقیق کے لیے ایک بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔

2۔ تحقیقی جستجو جاری رکھنے کا قرآنی فکر:

فنِ تحقیق نامعلوم حقائق کی تلاش تو ہے ہی، معلوم حقائق کی تعبیرِ نو اوران کی توسیع و تصحیح بھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ نئے حالات میں نئی نئی معنویتوں اور رہنمائیوں کا ذریعہ بھی ہے۔ محقق 'اگر صحیح معنوں میں محقق ہے، تو وہ یقیناً جویائے تحقیق ہو گا، ایسا جویائے تحقیق جس کا علم وادراک، تجربہ ومشاہدہ، وسعتِ مطالعہ، صبر و تحمل اور ذوقِ جستجو اسے دم لینے نہ دے گا اور وہ تلاشِ حقائق ہی میں سکون وسرور محسوس کرے گا۔ الغرض تحقیق 'فکر و جستجو کا ایک مسلسل اور جاری وساری عمل ہے[20]۔

مذکورہ واقعہ سے محققین کو یہ تعلیم ملتی ہے کہ وہ مزید تحقیقی عمل کو جاری رکھیں، سیدنا موسیٰؑ اپنے دور کے سب سے بڑے عالم تھے، جلیل القدر پیغمبر تھے، اس کے باوجود وہ مزید علم کے لیے سیدنا خضرؑ کے پاس گئے، اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے، حتیٰ کہ تعلیم کے لیے ان کے شرائط بھی تسلیم کئے۔اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اگر کوئی استاد کسی فن میں خوب مہارت حاصل کرے، تب بھی اس کو مزید تحقیق اور طلب جاری رکھنی چاہیے۔ تحقیق اور جستجو کے دامن کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔[21]

معاصر محقق محمد مکی ناصری لکھتے ہیں:

> "ولا ينبغي لأي عالم أن يقنع بما عنده من العلم دون أن يطلب المزيد دائما: {وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا}، بل عليه أن ينتهز جميع الفرص والمناسبات، لتلقي أطيب النفحات"[22]
>
> "کسی بھی عالم کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اُس علم پر قناعت کرے جو اس کے پاس ہے اور مزید طلب نہ کرے، کیونکہ قرآن کریم نے اسے مزید علم حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ کہ وہ اپنی صلاحتیوں اور مواقع کو علم حاصل کرنے میں لگائے، تاکہ وہ قیمتی متاع کو حاصل کرسکے۔"

حضرت سعید بن جبیرؒ کا قول ہے:

> "لا يزال الرجل عالما اذا ماتعلم فاذا ترک التعلم وظنّ انه قداستغنى فهواجهل مايكون"[23]
>
> "انسان جب تک علم حاصل کرتا رہے گا اس کا علم برقرار رہے گا جب طلبِ علم کو چھوڑ دے گا اور خود کو علوم سے مستغنی سمجھے گا تو وہ سب سے بڑا جاہل بن جائے گا۔"

تعلیمی و تحقیقی دنیا میں ایسے کئی اساتذہ اور پروفیسرز حضرات ہیں، جو ملازمت اور عہدہ ملنے کے بعد مزید تحقیق سے کنارہ کش ہوتے ہیں، اس طرح مدارس کے علماء میں اکثریت دورۂ حدیث کے بعد کتاب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں، حالانکہ قرآنی تصور تو یہ ہے کہ تحقیق وجستجو کا عمل جاری رہے، درپیش مسائل کا حل نکالا جائے اور آخری وقت تک کسی علمی و تحقیقی مشغلے میں مصروف عمل رہا جائے۔

3۔ تحقیقی عمل میں درپیش مشکلات برداشت کرنا:

علم و تحقیق کی تحصیل کا مرحلہ آسان نہیں ہے یہ کام بڑا صبر آزما اور دقّت طلب ہوتا ہے، اس ضمن میں متعدد ذہنی، جسمانی، مالی، سماجی اور دیگر مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بھوک اور تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ سفر کے مشکل مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام جب یوشع بن نون کے ساتھ سفر کررہے تھے، تو بہت زیادہ تھک گئے، اس تھکاوٹ کا تذکرہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا"[24]

"جب موسیٰ علیہ السلام آگے چلے، تو اپنے شاگرد سے کہا: ہمارا کھانا لاؤ اس سفر سے ہم کو بہت تھکان ہوئی ہے"

جب اللہ کے نبی تعلیم کے لیے تھکاوٹ برداشت کرتے ہیں' تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل کے لیے ہر ایک کو تکلیف برداشت کرنی پڑے گی، چاہے وہ متعلم ہو یا محقق، گویا تحقیقی عمل میں مشکلات کا آنا ایک ناگزیر عمل ہے، امام رازیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وهذا إخبار من موسى بأنه وطن نفسه على تحمل التعب الشديد والعناء العظيم في السفر لأجل طلب العلم وذلك تنبيه على أن المتعلم لو سافر من المشرق إلى المغرب لطلب مسألة واحدة لحق له ذلك"[25]

"یہ موسیٰؑ سے اخبار ہے کہ انھوں نے علم کی طلب میں سخت تکلیف اور تھکاوٹ برداشت کی، یہ اس بات کی خبرداری ہے کہ اگر کوئی متعلم صرف ایک مسئلے کے لیے مشرق سے مغرب تک سفر کرے تو یہ اس کا حق ہے۔"

نبی کریم ﷺ نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے، کہ علم حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، جسم کے راحت اور سکون کے ساتھ علم حاصل نہیں ہوسکتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"لَا يُسْتَطَاعُ الْعِلْمُ بِرَاحَةِ الْجِسْمِ"[26]

"جسم کی راحت کے ساتھ علم حاصل نہیں ہوسکتا ہے"

اہل علم نے بھی تعلیم و تحقیق کے لیے سفر ضروری قرار دیا ہے، علمِ حدیث کے لیے بھی نامور محدثین نے دور دور تک اسفار کی ہیں، اور مشکلات و تکالیف برداشت کی ہیں، چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا کہ کیا علم کے لیے سفر کرنا ضروری ہے، تو انھوں نے فرمایا:

"بلى والله شديداً ، لقد كان علقمة بن قيس النخعي ، . وهما من أهل الكوفة بالعراق، يبلغهما الحديث عن عمر،فلا يقنعهما حتى يخرجا إليه . إلى المدينة المنورة . ، فيسمعانه منه۔"[27]

"ہاں اللہ کی قسم بہت زیادہ، علقمہ بن قیس النخعی[28] عراق میں اہل کوفہ سے تعلق رکھتے تھے، ان کو عمرؓ سے احادیث پہنچی، وہ دونوں اس پر قناعت نہیں کرتے بلکہ اس کے لیے مدینہ منورہ جاتے اور وہاں پر وہ دونوں ان سے سنتے تھے۔"

4۔ حصولِ مقصد کے لیے مضبوط و مستحکم قوتِ ارادی (Will Power):

ہر کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مضبوط ارادے کی ضرورت ہوتی ہے، چہ جائے کہ تحقیق جیسا مہتم بالشان کام میں مصمم و مستحکم ارادے کی بڑی اہمیت ہے، تحقیق قوتِ اردای کے ساتھ تلاش کا عمل جاری رکھنے، حقائق کا جائزہ لینے اوران کے اثرات معلوم کرنے کا نام ہے[29]۔ اگر اردہ مضبوط نہ ہو تو تحقیق کرنا مشکل ہے، تحقیقی عمل میں ہر قسم کے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہو گا۔ سیدنا موسیٰؑ نے مصمم ارادہ کیا، کہ میں مقصد کے حصول تک لگا رہوں گا، جس کا تذکرہ اس واقعہ میں ان الفاظ کے ساتھ ہوا ہے:

"وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّى أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا"[30]

"اور جب موسیٰؑ نے اپنے شاگرد سے کہا: کہ جب تک میں دو دریاؤں کے سنگم کو نہ پہنچ جاؤں، ٹلنے کا نہیں خواہ صدیوں تک چلتا رہوں۔"

علامہ زمخشری[31] اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"المعنى: لا أبرح ما أنا عليه، بمعنى: ألزم المسير والطلب ولا أتركه ولا أفارقه حتى أبلغ"[32]

"لا ابرح کا معنی ہے کہ میں اپنے آپ پر ہمیشہ سفر اور طلب لازمی کرتا ہوں، میں اس کو نہیں چھوڑ دوں گا، اور نہ ہی اس سے علیحدہ ہوں گا، یہاں تک کہ میں اس مقام کو پہنچ جاؤں۔"

آج المیہ یہ ہے کہ اکثر محققین تحقیق کے لیے مصمم ارادہ نہیں رکھتے بلکہ ان کا مقصد محض ڈگری کا حصول ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ معمولی امور پر حوصلہ شکن ہو کر تحقیقی عمل کو خیر باد کہہ دیتے ہیں، اس لیے محققین کو چاہئے کہ وہ مقصد تک پہنچنے کے لیے مضبوط عزم وارادہ رکھ کر آگے بڑھیں، تو مشکلات خود بخود ختم ہو جائیں گی۔

5۔ تحقیقی عمل میں تعلّی اور تکبر سے منزّہ صیغوں کا استعمال:

محقق کو چاہئے کہ وہ تحقیق میں ایسے صیغوں کے استعمال سے گریز کرے، جن سے تکبر اور تعلّی کی بو آتی ہو، علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے، اپنے آپ کو عالم اور جاننے والا نہیں کہنا چاہیے، اسی نسبت (جو کہ حقیقت بھی تھی) کی وجہ سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو ایک عبدِ صالح سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔[33]

تعلیمی اور تحقیقی دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنے علم اور فن اور اپنے مہارت اور تحقیق پر غرور و تکبر کرتے ہیں، اپنے مقابلے میں دوسرے لوگوں کو کمزور سمجھ کر ان کی کمزوریوں کو لوگوں کے سامنے طشت از بام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے محقق میں عاجزی وانکساری کا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو تعلیم دیتے ہوئے سیدنا خضر علیہ السلام نے فرمایا:

"مَا نَقَصَ عِلْمِي وَعِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللهِ إِلَّا مِثْلَ مَا نَقَصَ هَذَا العُصْفُورُ بِمِنْقَارِهِ مِنَ البَحْرِ"[34]

"میرے اور تمہارے علم نے اللہ کے علم میں سے اتنا ہی کم کیا ہو گا، جتنا اس چڑیا نے سمندر کے پانی سے۔"

اس لیے قرآن کریم نے علماء اور محققین میں تکبر اور غرور کے اس بد خصلت کی اصلاح کرتے ہوئے اس سے باز رہنے کی تاکید کی ہے۔ بلکہ علم اور تحقیق کا مقصد ہی اخلاص، خشیت اور للہیّت قرار دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ"[35]

"بے شک اللہ کے بندوں ان سے زیادہ ڈرنے والے علماء ہی ہیں۔"

6۔ تحقیقی عمل میں بالمشافہ (Face to Face) سیکھنے کی اہمیت:

اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے استاد کی مصاحبت ضروری ہے، گھر بیٹھے علم حاصل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ استاد سے بالمشافہ سیکھنے کے لیے کلاسوں اور ورکشاپس میں شرکت ضروری ہے، امام شافعیؒ کا فرمان ہے:

"من تفقه من بطون الكتب ضيع الاحكام"[36]

"جو (استاد کے بغیر) محض کتابوں سے فقہ حاصل کرتا ہے وہ احکام کو ضائع کرے گا۔"

اگر دیکھا جائے تو یونیورسٹیوں کا موجودہ نظام اور ہائیر ایجوکیشن کمیشن اس قرآنی اصول پر اچھی طرح عمل پیرا ہیں، کہ کوئی بھی محقق ایم فل اور پی ایچ ڈی میں بالمشافہ تعلیم کے بغیر محقق نہیں بن سکتا ہے، چاہیے وہ کوئی بھی یونیورسٹی ہو لیکن اس کے سکالرز کو کورس ورک کے دوران بالمشافہ کلاس لینے کی پابندی لازمی ہوگی، جس سے سکالرز پر ایک اچھا اثر مرتب ہو رہا ہے۔ پھر کورس ورک کے بعد تحقیقی عمل بھی کسی سپروائزر کے زیر نگرانی پایہ تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔

7۔ نئے موضوعات پر ورکشاپس اور سیمینارز کا انعقاد:

زیر مطالعہ واقعہ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ تعلیم کے لیے سفر کرنا صرف متعلم کا کام نہیں بلکہ بعض اوقات نئے موضوعات پر منعقد ورکشاپس، کانفرنسز اور تربیتی پروگراموں میں اساتذہ کی شرکت بھی ضروری ہوتی ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام معلّم تھے، بنی اسرائیل کے عالی قدر پیغمبر تھے، لیکن اس کے باوجود سیدنا خضر علیہ السلام کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا حکم ملا۔[37]

پاکستانی جامعات میں اس اصول کے مطابق وقت بوقت نئے موضوعات پر سیمینارز منعقد ہوتے ہیں، جس میں اساتذہ اور پروفیسرز حضرات شرکت کرکے نئے موضوعات پر اپنی تحقیقات پیش کرتے ہیں، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اکثر اوقات ان سیمینارز کے لیے وہی لوگ مدعو کئے جاتے ہیں، جن کا کوئی سفارشی لنک ہو یا انتظامیہ کے ساتھ مضبوط تعلق۔ اس لیے اس حوالے سے ایسے اصلاحات کی ضرورت ہے، جس سے ہر قسم کے سکالرز اور نو قلم لکھاریوں کو مستفید ہونے کا موقع ملے۔

8۔ تحقیقی میدان میں طلبہ کے ساتھ مناقشے (Discussions/ Discourses) کا اہتمام کرنا:

مذکورہ قصے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تحقیقی میدان کے اساتذہ کو چاہیئے کہ وہ طلبہ کے ساتھ مناقشہ کا اہتمام کرے۔ کیونکہ جن طلبہ کے پاس علم ہو اور استدلال سے ممارست بھی رکھتے ہوں ان کو مناقشے کے بغیر مطمئن نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے استاد کو صبر واستقامت سے بات کرنی چاہیئے، جن طلبہ کے پاس علم نہ ہو، اور نہ ہی استدلال سے ان کی ممارست ہو، ایسے طالب علم کو پڑھانا اور تعلیم دینا آسان ہوتا ہے۔[38] اس کے برعکس اول الذکر طلبہ جن کو عمومی اصطلاح میں محققین کہا جاتا ہے' ان کی پڑھائی میں مناقشے کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔ امام رازیؒ اس حوالے سے ان آیات کے ذیل میں ان دونوں قسموں کے طلبہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اعلم أن المتعلم على قسمين متعلم ليس عنده شيء من العلم ولم يمارس القيل والقال ولم يتعود التقرير والاعتراض ومتعلم حصل العلوم الكثيرة ومارس الاستدلال والاعتراض

ثم إنه يريد أن يخالط إنساناً أكمل منه ليبلغ درجة التمام والكمال والتعلم في هذا القسم الثاني شاق شديد وذلك لأنه إذا رأى شيئاً أو سمع كلاماً فربما كان ذلك بحسب الظاهر منكراً إلا أنه كان في الحقيقة حقاً صواباً۔"[39]

"جان لو کہ متعلم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ متعلم جس کے پاس کوئی علم نہ ہو، اور قیل و قال سے ممارست بھی نہ ہو، اور نہ کوئی تقریر اور اعتراض کر سکتا ہو، دوسری قسم کے متعلم وہ ہے جس کے پاس کثیر علوم ہو، اور استدلال و اعتراض سے ممارست ہو، پھر اس قسم کا طالب علم ایسے آدمی سے ملنا چاہتا ہے جو اس سے زیادہ علم میں کامل ہو، تاکہ وہ اس سے کچھ جان کر کمال کے درجہ کو پہنچ جائے۔ اس دوسری قسم کے طلبہ کو تعلیم دینا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ یہ لوگ جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں، یا سنتے ہیں، تو بعض اوقات اس کا ظاہر برا ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ صحیح ہوتا ہے۔"

الغرض اس قسم کے محققین کو مطمئن کرنے کے لیے ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر مکالمے اور مناقشے کرنے چاہئے، اکثر طلبہ کا یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ بے ادبی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی بے ادبی اور بد اخلاقی نہیں ہے، علماء اور فقہاء کے نزدیک علمی واجتہادی مسائل میں استاد اور شاگرد کے مناقشے اور مکالمے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، امام ابو حنیفہؒ اپنے شاگردوں کے ساتھ بحث کرنے کے بعد مسئلہ کو لکھتے تھے، علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں:

"فكان إذا وقعت واقعة شاورهم وناظرهم وحاورهم وسألهم فيسمع ما عندهم من الأخبار والآثار ويقول ما عنده ويناظرهم شهرا أو أكثر حتى يستقر آخر الأقوال فيثبته أبو يوسف ، حتى أثبت الأصول على هذا المنهاج ، شورى"[40]

"ابو حنیفہ کو جب کوئی مسئلہ پیش آتا' آپ اپنے شاگردوں سے باہمی مشورہ کرتے، اُن سے بحث مباحثہ کرتے اوران سے سوال کرتے۔ اسی طرح ان کے پاس موجود اخبار و احادیث کی ان سے سماعت کرتے۔ جو کچھ آپ کے علم میں ہوتا، اسے بیان کر دیتے، ایک ایک ماہ یا اس سے بھی زیادہ عرصے ان سے مناظروں اور بحث و مباحثہ کرتے رہتے، یہاں تک کہ ایک اصول پر اتفاق ہوتا، پھر امام ابو یوسف اسے ضبط تحریر میں لے آتے، اسی منہج پر آپ نے اصول قائم کر دیئے"

ہمارے ہاں بحث و مباحثے کا رجحان بہت کم ہے، عام لوگ کیا بعض اہل علم بھی اس کو بے ادبی قرار دیتے ہیں، اس لیے اہل علم میں اس رجحان کو عام کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ بحث و مباحثے کا ماحول عقل کی پختگی کا باعث ہے، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا ارشاد ہے:

"ملاحاة الرجال تلقيحا لألبابهم"[41]

"رائے ہے کہ لوگوں کا باہمی مباحثہ ان کی عقلوں کی بارآوری کا ذریعہ ہے۔"

9۔ علمی و تحقیقی محاضرات کے آخر میں سوال و جواب (Questioning) کے سیشن کا اہتمام کرنا:

زیر نظر واقعہ میں "فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا"[42] سے اس تحقیقی اصول کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ طالب علم درس اور لیکچر کے دوران سوال نہ کرے، بلکہ لیکچر ختم ہونے کے بعد متعلقہ موضوع کے بارے میں سوال کر سکتا ہے۔ اس لیے اساتذہ کو چاہئے کہ وہ لیکچر کے آخر میں طلبہ کو سوال کا موقع دے دیں۔ اس طرح استاد اس بات کا خیال

رکھے کہ طلبہ کے سوالات کے بالترتیب جوابات دے دیں، جیسے سیدنا خضر علیہ السلام نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے اشکالات کے بالترتیب جوابات دیے۔ عصری جامعات میں تقریباً یہی طریقہ متعارف ہے کہ لیکچر کے آخر میں سوالات کے جوابات کا اہتمام کیا جاتا ہے، جامعات کی طرح دینی مدارس میں بھی لیکچرز کے بعد سوال وجواب کے سیشن کا اہتمام ہونا چاہئے۔ یہ سیکھنے سکھانے اور غلط فہمیاں دور کرنے کا ایک بہترین عمل ہے۔

10۔ محققین کا امتحان لینا:

زیر بحث واقعہ سے یہ اصول بھی معلوم ہوا کہ استاد کو چاہئے کہ وقتاً فوقتاً طلباء اور سکالرز کا امتحان لیتا رہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان کی علمی استعداد کتنی بن چکی ہے، اور انہوں نے کتنا استفادہ اور کتنی محنت کی ہے۔[43] طلبہ سے امتحان لینا انتہائی اہمیت کا حامل ہے، مفکرین تعلیم نے امتحان کو تعلیمی ڈھانچے کا بنیاد قرار دیا ہے، امام بخاریؒ نے امتحان کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے صحیح بخاری میں اس عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا ہے: **"باب طرح الإمام المسألة على أصحابه ليختبر ما عندهم من العلم"**[44] یعنی ایک استاد اپنے رفقاء کی علمی آزمائش کے لیے کوئی سوال کرے۔[45]

11۔ محقق کا کسی خاص فن میں متخصص (Specialist) ہونا:

استاد کو چاہئے کہ وہ طلبہ کو خاص فنون میں تخصص کرالے، **"وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا**[46]**"** میں علماً مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جس کا مطلب ہے کہ ہم نے انہیں ایک خاص قسم کا علم دیا تھا، وہ علمِ خاص وحی کے علوم تھے۔[47] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص فن میں تخصص اور مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، کیونکہ آدمی ہر فن میں مکمل ماہر نہیں ہو سکتا البتہ کسی خاص فن میں اس کو کامل مہارت حاصل ہو سکتی ہے۔

عرب جامعات اس کا عملی مصداق ہیں، جہاں ہر ایک آدمی ایک مخصوص فن کا ماہر ہو گا، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص تفسیر کا ماہر ہو اور آپ ان سے حدیث کے بارے میں پوچھ لیں تو وہ آپ کو حدیث کے ماہر سے پوچھنے اور حدیث کے ڈیپارٹمنٹ سے رجوع کرنے کا مشورہ دے گا، اس طرح اگر آپ فقہ اور قانون کے ماہر سے سیرت کے بارے میں پوچھ لیں تو وہ خاموشی اختیار کرلے گا، اور متعلقہ ماہرین سے پوچھنے کی رائے دے گا، حالانکہ اس بات پر وہ کسی قسم کا شرم محسوس نہیں کرتے ہیں، ہماری جامعات میں رہنے کے لیے زیادہ تر ہر فن مولا ہونے کا تقاضا کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اکثر اوقات محقق کسی ایک فن میں بھی ماہر نہیں بن سکتا۔

12۔ تحقیقی عمل میں استاد یا ادارہ کے شرائط کو تسلیم کرنا:

تحقیقی عمل میں یونیورسٹی کی طرف سے یا استاد کی طرف سے بعض اوقات محققین کے لیے کچھ شرائط رکھی جاتی ہیں جن کو ماننا اور اس حوالے سے مشکلات پر صبر کرنا تحقیقی عمل کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے، قصۂ موسیٰؑ وخضر علیہما السلام سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ استاد یا ادارہ اگر شاگرد پر اصول وضوابط اور شرائط (Rules/ Regulations/ Conditions) لاگو کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے، جس طرح سیدنا خضر علیہ السلام نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر شرائط لاگو کرتے ہوئے فرمایا:

”فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّى أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا“[48]

”اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہو تو تو شرط یہ ہے کہ مجھ سے کوئی بات نہ پوچھنا، جب تک میں خود اس کام کا ذکر تم سے نہ کروں۔“

13۔ محققین کو بامقصد، مفید و کارآمد علوم سکھانے کی ضرورت:

جو محقق اپنا مال جان اور وقت لگا کر تحقیق کرتا ہے تو اساتذہ پر یہ بات ضروری ہے کہ اس کو ایسے علوم سکھائے، جو اس کے لیے مفید ہوں، اور ایسے علوم میں اس کا وقت ضائع نہ کیا جائے، جو محقق کے لیے کارآمد نہ ہوں، اس واقعہ میں "مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا"[49] سے معلوم ہوتا ہے کہ استاد اپنے شاگردوں کو وہ علوم سکھائے جو مفید اور کارآمد ہوں، بے کار اور لایعنی باتوں میں طلبہ کا وقت ضائع نہ کیا جائے۔[50]

اس طرح جو موضوع سکالر کو تحقیق کے لیے دیا جاتا ہے وہ بھی اس سکالر کے علم کا حصہ ہے۔ اس لیے موضوعاتِ تحقیق جاندار اور مفید موضوعات ہونا چاہئے، عموماً جامعات میں اس حوالے سے بعض اوقات تساہل پسندی سے کام لیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے سکالر کو ایسا موضوع دیا جاتا ہے، جس کا نہ سکالر کو کوئی فائدہ ہوتا ہے، اور نہ معاشرے کو، سوائے سکالر کے ڈگری اور ایچ ای سی کے خرچ کے کچھ ہاتھ نہیں آتا، اس لیے اس حوالے سے مذکورہ قرآنی اصول کے تناظر میں اصلاحات کی ضرورت ہے۔

14۔ سکالرز پر ان کی استطاعت (Capacity) کے مطابق بوجھ ڈالنا:

سکالرز پر ان کے استطاعت کے مطابق بوجھ ڈالنا چاہئے، اس واقعہ میں "وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا"[51] کا مطلب ہے "لا تحملني ما لا اطيقه من الارهاق " یعنی طاقت سے زیادہ بوجھ مجھ پر مت ڈالو، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ استاد طالب علم پر اتنا بار نہ ڈالے جو اس کی طاقت سے زیادہ ہو، چاہے وہ خدمت کے حوالے سے ہو یا تعلیم و تحقیق کے حوالے سے ہو، مثلاً طالب علم کو کلاس میں اس قدر پڑھایا جائے جو اس کے لیول کے مطابق ہو، بی ایس کے طالب علم کو ایم ایس اور ایم ایس کو پی ایچ ڈی سطح کی کتابوں کی تدریس نہیں کرنی چاہیے، بلکہ متعلقہ کلاس کے طلبہ اور محققین کو ان کی استطاعت اور علمی مستویٰ کے مطابق پڑھانا ضروری ہے۔

15۔ محقق کو استفادے کے لیے خاموش رہنا:

محقق جب استاد سے استفادے کا خواہش مند ہو تو اس کو خاموش رہنا چاہئے اور خاموشی سے استاد کی باتوں کو سننا چاہئے، اس واقعہ میں "فَانْطَلَقَا" تثنیہ کا صیغہ ہے، جب کہ یہ حضرات تین تھے، سیدنا خضر علیہ السلام، سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور یوشع بن نون، اس کی وجہ یہ ہے کہ یوشع بن نون پوری توجہ اور خاموشی سے ان دونوں کے تابع تھے، تو اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ کلاس میں استاد سے پوچھنا چاہئے لیکن اساتذہ کے مجلس میں شاگردوں کو خاموشی سے بیٹھنا چاہئے تاکہ وہ اساتذہ کی باتوں کو غور سے سن لیں۔[52] امام رازیؒ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”وكل ذلك يدل على أن الواجب على المتعلم إظهار التواضع بأقصى الغايات“[53]

[54]”یہ سب اس کی دلیل ہے کہ متعلم پر نہایت تواضع کا اظہار واجب ہے“[55]

نتائج بحث:

درج بالا بحث سے درج ذیل نکات اخذ کیے جاسکتے ہیں:

1۔ تحقیق کی اہمیت و معنویت ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، اسی اہمیت کو مد نظر رکھ کر اس کے لیے اُصول وضوابط متعین کرنا بھی ضروری ہے۔ علوم اسلامیہ میں ان اصول وضوابط کا اوّلین ماخذ قرآنِ کریم اور دوسرا ماخذ سنتِ رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم ہے۔

2۔ عموماً مغرب کو تعلیمی و تحقیقی نظریات اور اصول وضوابط کا بانی مبانی سمجھا جاتا ہے، حالانکہ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی و تحقیقی رجحانات وافکار میں قرآن کریم کو درجۂ اولیت حاصل ہے۔

3۔ قرآنِ کریم سے تحقیق کے حوالے سے جو اصول وآداب مستنبط ہوتے ہیں وہ تعلیمی و تحقیقی اداروں کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ہے، ان اصول کو مد نظر رکھ کر مسلم مفکرین اور محققین نے اس موضوع پر نہایت اہم اور مفید کتب مرتب کی ہیں۔

4۔ جو اصولِ تحقیق قرآن کریم سے مستنبط ہوتے ہیں، وہ نہایت معتدل اور متوازن ہیں، جو ہر دور میں یکساں مفید اور کارآمد ہیں اور ان کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔

5۔ قصہ موسیٰ وخضر علیہما السلام سے مستنبط مذکورہ اصول سے اکثر مقامات پر معاصر تحقیقی نظام کی حوصلہ افزائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، جب کہ بعض مقامات پر ان اصولوں سے معاصر تحقیقی نظام کے بعض اصلاح طلب پہلوؤں کی نشان دہی بھی ہوسکتی ہے۔

سفارشات:

1۔ قرآن کریم کی مختلف آیاتِ مبارکہ سے تحقیق کے اصول کے بارے میں اشارات ملتے ہیں، جس کی توضیح مفسرین نے اپنی تفاسیر میں کی ہیں، اس لیے اس موضوع پر تحقیقی کام کرنے اور معاصر تحقیقی نظام پر اس کے اثرات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس لیے اس مضمون کی وساطت سے "قرآنِ کریم سے مستنبط اصول تحقیق کا تفسیری مطالعہ اور جدید تحقیقی نظام پر اس کے اثرات" کے عنوان پر تحقیقی کام کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔ جس کی ایک مختصر مثال زیر نظر مقالہ ہے۔

2۔ مغرب کو عموماً اصولِ تحقیق کا بانی سمجھا جاتا ہے جب کہ مسلمان علماء کا مؤقف ہے کہ اس باب میں قرآن کریم کو اولیت کا درجہ حاصل ہے، اس لیے قرآن کریم سے مستنبط اصولِ تحقیق اور مغربی اصولِ تحقیق کے درمیان تقابلی مطالعہ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

حواشی وحوالہ جات:

[1] سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اردو میں اصولِ تحقیق: منتخب مقالات (لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، اپریل ۲۰۰۹ء) حصہ: اوّل، ص: ۷

[2] سعید بن جبیرؓ ۴۵ھ = ۶۲۶ء کو پیدا ہوئے، حبشی الاصل تھے، مشہور تابعی تھے، سیدنا عبد اللہ ابن عباسؓ اور سیدنا عبد اللہ بن عمرؓ کے شاگرد تھے۔ اہل کوفہ کے مفتی تھے۔ آپ ۴۹ سال کی عمر میں ۹۵ھ / ۷۱۴ء کو حجاج کے ہاتھوں شہید کئے گئے۔[خير الدين بن محمود الزركلي (م: ۱۳۹۶ھ)، الأعلام للزركلي (دار العلم للملايين، مئی ۲۰۰۲ء) ۳/ ۹۳]

[3] سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ بن عبد المطلب قریشی، ہاشمی، ۳ قبل ہجری / ۶۱۹ء کو پیدا ہوئے، رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے چچازاد بھائی، جلیل القدر صحابی ہیں۔ حبر الامہ اور ترجمان القرآن جیسے القاب سے نوازے گئے، طائف میں سکونت پذیر تھے، اور وہیں ۶۸ھ / ۶۸۷ء کو وفات پائی۔[خير الدين بن محمود الزركلي (م: ۱۳۹۶ھ)، الأعلام للزركلي، (دار العلم للملايين، مايو ۲۰۰۲ء) ۴/ ۹۵]

[4] صحیح البخاري، بَابُ حَدِيثِ الخَضِرِ مَعَ مُوسَى عَلَيْهِمَا السَّلاَمُ، رقم الحدیث: ۳۴۰۱، (قاہرہ، دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ) ۴/ ۱۵۴

[5] نوف البکالی تابعی ہیں، حمیر قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے والد کا نام فضالہ تھا، بکال کی نسبت بنی بکال بن دعمی بن سعد بن عوف کی طرف کی جاتی ہے جو حمیر کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔[العسقلانی، احمد بن علی بن محمد بن حجر، فتح الباري (بیروت، دار المعرفۃ، ۱۳۷۹ھ) ۸/ ۴۱۳] آپ شام کے رہنے والے تھے اور حمیر قبیلے کے ذیلی شاخ بکالہ سے تعلق رکھتے تھے۔[جمال الدین أبو الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد الجوزي (المتوفى: ۵۹۷ھ)، کشف المشکل من حدیث الصحیحین، (دار الوطن، الریاض) ۲/ ۹۵]

[6] سیدنا ابی بن کعب بن قیس بن عبید نجاری، خزرجی، انصاری۔ قبول اسلام سے پہلے یہود کے احبار میں سے تھے، کتب سابقہ پر گہری نظر تھی، کاتبین وحی میں سے تھے، غزوہ بدر، احد، خندق اور دوسرے غزوات میں شریک ہوئے، جنگ جابیہ میں سیدنا عمرؓ کے ہم رکاب تھے، بیت المقدس والوں کے لئے صلح نامہ آپ ہی نے تحریر کیا، آپ کی مرویات ۱۲۴ ہیں، مدینہ منورہ میں ۲۱ھ / ۶۴۲ء کو وفات پائی۔ [أبو الحسن علي بن أبي الکرم، عز الدین ابن الأثیر (م: ۶۳۰ھ)، أسد الغابۃ (دار الفکر، بیروت، ۱۹۸۹ء) ۱/ ۱۶۸]

[7] یوشع بن نون موسیٰ علیہ السلام کے خادم اور شاگرد تھے، آپ یوسف علیہ السلام کے اولاد میں سے تھے، شجرہ نسب یوں ہے: یوشع بن نون بن الیشامع ابن عمیھوذ بن بارص بن بعدان بن ناخر بن تالخ بن راشف بن رالح بن بریع ابن افرائیم بن یوسف علیہ السلام بن یعقوب علیہ السلام۔[أبو محمد محمود بن أحمد الحنفی بدر الدین العینی (المتوفی: ۸۵۵ھ)، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، (دار إحیاء التراث العربي، بیروت، س۔ن) ۲/ ۶۳]

[8] سورۃ الکہف ۱۸: ۶۲

[9] سورۃ الکہف ۱۸: ۶۴

[10] صحیح البخاري، بَابُ حَدِيثِ الخَضِرِ مَعَ مُوسَى عَلَيْهِمَا السَّلاَمُ، رقم الحدیث: ۳۴۰۱، (قاہرہ، دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ) ۴/ ۱۵۴

[11] صحیح البخاري، بَابُ حَدِيثِ الخَضِرِ مَعَ مُوسَى عَلَيْهِمَا السَّلاَمُ، رقم الحدیث: ۳۴۰۱، (قاہرہ، دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ) ۴/ ۱۵۴

[12] سورۃ الکہف ۱۸: ۷۱

[13] سورۃ الکہف ۱۸: ۷۴

[14] سورۃ الکہف ۱۸: ۷۷

[15] سورۃ الکہف ۱۸: ۷۹ تا ۸۲

[16] صحیح البخاري، بَابُ حَدِيثِ الخَضِرِ مَعَ مُوسَى عَلَيْهِمَا السَّلاَمُ، رقم الحدیث: ۳۴۰۱، (قاہرہ، دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ) ۴/ ۱۵۶

[17] سورۃ الکہف ۱۸: ۶۰

[18] مدنی، دکتور شیر علی شاہ، تفسیر سورۃ الکہف (اکوڑہ خٹک، مکتبۃ الجہاد، ۱۴۲۷ھ) ۲۷۲

[19] نفس مصدر، ص: ۲۷۴

[20] ظفر الاسلام خان، ڈاکٹر، اُصولِ تحقیق: جدید ریسرچ کے اصول وضوابط (اسلام آباد، یورپ اکیڈمی، طبع اوّل: فروری ۲۰۱۵ء)، ص: ۱۰

21 النسفي، أبو البركات عبد الله بن أحمد، مدارك التنزيل (بيروت، دار المعرفة، س۔ن) ۳/ ۲۰۵

22 الناصري، محمد المكي، التيسير في أحاديث التفسير (بيروت، دار الغرب الإسلامي، ۱۹۸۵ء) ۳/ ۴۵۹

23 الکنانی، ابن جماعۃ، تذکرۃ السامع والمتکلم فی ادب العالم والمتعلم (کراچی، بیت العلم، س،ن) ۴۷

24 سورۃ الکہف ۱۸:۶۲

25 الرازي، فخر الدين محمد بن عمر، مفاتيح الغيب (بيروت، دار الكتب العلمية، ۲۰۰۰ء) ۲۱/ ۱۲۴

26 صحیح مسلم، بَابُ أَوْقَاتِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ، رقم الحدیث: ۶۱۲ (بیروت، دار إحیاء التراث العربی، ۲۰۰۲ء) ۱/ ۴۲۸

27 رحلۃ العلماء فی طلب العلم، ماجد إسلام البنكاني (الإمارات العربیۃ المتحدۃ، مكتبۃ عجمان، س،ن) ص: ۹۱

28 علقمہ بن قیس بن عبد اللہ بن مالک الہمدانی۔ ابو شبل ان کی کنیت تھی، تابعی اور اہل عراق کے فقیہ تھے، رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پیدا ہوئے، آپ نے صحابہ کرامؓ سے روایات نقل کیں۔ جنگ صفین میں شریک ہوئے، خوارزم اور مرو میں مقیم رہے، آخر میں کوفہ آئے اور یہاں پر ۶۲ھ / ۶۸۱ء میں وفات پا گئے۔ [ابو بکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب بغدادی، تحقیق: بشار عواد، تاریخ مدینۃ السلام واخبار محدثیھا وذکر قطانھا العلماء من غیر اھلھا ووارد یھا (المعروف تاریخ بغداد) (دار الغرب الاسلامی بیروت، ۲۰۰۱ء) ۱۴/ ۲۴۰]

29 افتخار احمد خان، ڈاکٹر، اُصولِ تحقیق (بھوانہ بازار، فیصل آباد، شمع بکس، بارِ دوم: اپریل ۲۰۱۵ء)، ص: ۲۵

30 سورۃ الکہف ۱۸:۶۰

31 محمود بن عمر بن محمد بن احمد الخوارزمی الزمخشری جار اللہ ابو القاسم۔ لغت، ادب اور نحو کے امام تھے، خوارزم کے علاقے زمخشر میں ۴۶۷ھ / ۱۰۷۵ء کو پیدا ہوئے، حصول علم کے لئے بغداد چلے گئے، فروع اور فقہی مسائل میں حنفی تھے، لیکن معتزلی العقیدہ تھے۔ ۵۳۸ھ / ۱۱۴۴ء کو وفات پا گئے۔ [سیر اعلام النبلاء، ۲۰/ ۱۵۱]

32 الزمخشري، أبو القاسم محمود بن عمرو بن أحمد، الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل (بيروت، دار الكتاب العربي، ۱۴۰۷ء) ۲/ ۷۳۱

33 محمد بن فتوح، الجمع بین الصحیحین (بیروت، دار ابن حزم، ۱۴۲۳ھ) ۱/ ۲۴۴

34 صحیح البخاري، بَابُ حَدِيثِ الخَضِرِ مَعَ مُوسَى عَلَيْهِمَا السَّلاَمُ، رقم الحدیث: ۳۴۰۱، (قاہرہ، دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ) ۴/ ۱۵۴

35 سورۃ فاطر ۳۵:۲۸

36 الکنانی، ابن جماعۃ، تذکرۃ السامع والمتکلم فی ادب العالم والمتعلم (کراچی، بیت العلم، س،ن) ۴۷

37 الرازي، فخر الدين محمد بن عمر، مفاتيح الغيب (بيروت، دار الكتب العلمية، ۲۰۰۰ء) ۲۱/ ۴۷۷

38 جلال الدین السیوطی، تفسیر جلالین (دہلی، اصح المطابع، ۱۹۳۷ء) ۲۴۹

39 الرازي، فخر الدين محمد بن عمر، مفاتيح الغيب (بيروت، دار الكتب العلمية، ۲۰۰۰ء) ۲۱/ ۱۲۹

40 ابن عابدین، محمد أمین، رد المحتار علی الدر المختار (بیروت، لبنان، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، ۱۹۹۵ء) ۱/ ۴۲

[41] ابن عبد البر، حافظ ابو عمر یوسف بن عبد اللہ، جامع بیان العلم وفضلہ (مملکۃ العربیہ، مطبعہ الموسوعات العربیۃ، ۱۳۲۰ھ) ۳۸۲

[42] سورۃ الکہف ۱۸:۷۰

[43] مدنی، دکتور شیر علی شاہ، تفسیر سورۃ الکہف (اکوڑہ خٹک، مکتبۃ الجہاد، ۱۴۲۷ھ) ۳۰۸

[44] صحیح البخاري، بَابُ طَرْحِ الإِمَامِ المِسْأَلَةَ عَلَى أَصْحَابِهِ لِيَخْتَبِرَ، رقم الحدیث: 62 (قاہرہ، دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ) ۱/۲۲

[45] مولانا محمد زکریا، تقریر بخاری (کراچی، مکتبہ الشیخ، ۱۳۳۹ھ) ۱/۱۶۶

[46] سورۃ الکہف ۱۸:۴۵

[47] مدنی، دکتور شیر علی شاہ، تفسیر سورۃ الکہف (اکوڑہ خٹک، مکتبۃ الجہاد، ۱۴۲۷ھ) ۲۸۴

[48] الشیخ عبد السلام، مختصر تفسیر قرآن، (لاہور، دار السلام، ۲۰۰۲ء) ۷۵۳

[49] سورۃ الکہف ۱۸:۴۴

[50] ابن کثیر، عماد الدین، تفسیر ابن کثیر (دار الفکر مصر، س ن) ۴/۹۶

[51] سورۃ الکہف ۱۸:۷۳

[52] مدنی، دکتور شیر علی شاہ، تفسیر سورۃ الکہف (اکوڑہ خٹک، مکتبۃ الجہاد، ۱۴۲۷ھ) ۳۱۲

[53] الرازي، فخر الدین محمد بن عمر، مفاتیح الغیب (بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۲۰۰۰م) ۲۱/۱۳۰

[54] سورۃ الکہف ۱۸:۴۴

[55] سورۃ الکہف ۱۸:۴۴